کرتوت

مائل خیرآبادی

کرتوت

چاندنی رات تھی، میں چارپائی پر لیٹا تھا۔ ابھی میری نیند کچی ہی تھی کہ آس پاس کچھ کھُسر پھُسر ہوتی سنی۔ دھیان دیا میرے ہی ہاتھوں، پیروں، آنکھوں اور کانوں میں کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ بیچ میں میاں پیٹ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ سب سے کہہ رہا تھا:

''دوستو! یہ میرا مالک، یہی احمد سعید، جس کا میں ہاتھ کہلاتا ہوں۔ ابھی ہے کتنا سا لیکن اس کے کرتوت تو دیکھو اللہ میاں نے اس کو جو ذرا سا اختیار دے دیا ہے، کہ اپنی مرضی سے بھی کچھ کر سکتا ہے تو آپے میں نہ رہا۔ خدا کو بھول گیا، گھمنڈ کرنے لگا۔ اللہ میاں نے مجھے اس کے بس میں کر دیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ مجھ سے خیرات کرتا لیکن کرتا یہ ہے کہ لوگوں کے پیسے چھینتا ہے۔ اپنے سے کمزور بچوں کے چپتیں لگاتا ہے، مارتا ہے۔ دیکھو تو، پڑھتا کچھ ہے، لکھتا کچھ ہے۔ ایک دن ایک پرچے پر گالیاں لکھ کر شوکت کو دیں، گندے گانے تو لکھ لکھ کر روز ہی بانٹتا ہے۔ توبہ توبہ! کتنا بُرا ہے احمد سعید۔ میں تو اس سے پریشان ہو گیا ہوں۔''

ہاتھ چپ ہوا تو پیر بولا۔ ''ہاں یار! یہ ایسا ہی ہے مجھ کو بھی پریشان کرتا ہے۔ اللہ میاں نے مجھے بھی اس کے بس میں کر دیا ہے۔ اسے چاہئے تھا، مسجد

جاتا، اللہ کی مرضی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتا مگر کرتا کیا ہے؟ بُرے کھیلوں کی طرف دوڑتا ہے۔ لڑکوں کے لنگڑی لگا کر انھیں گرا دیتا ہے، ٹھوکریں مارتا ہے۔ بھائی ہاتھ! تم نے بالکل سچ کہا۔ یہ احمد سعید بڑا ہی بُرا ہے۔''

پیر چپ ہوا تو آنکھ پھڑک کر بولی۔ ''ہاں جی! یہ ایسا ہی ہے۔ دیکھو نا! اللہ میاں نے مجھے اس کے چہرے پر کیسی اچھی جگہ فٹ کیا ہے۔ میری بدولت کیسی خوبصورتی آ گئی ہے اس کے چہرے میں۔ بھائی ہاتھ اور پیر! آپ دونوں نے بالکل ٹھیک کہا کہ اللہ میاں نے اسے ہم پر ذرا سا اختیار کیا دے دیا کہ یہ آپے میں نہیں رہا۔ اتراتا پھرتا ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ ہم سے اللہ میاں کی مرضی کے مطابق کام لیتا۔ قرآن اور حدیث اور اچھی کتابیں دیکھتا۔ مگر بے شرمی سے مجھے مٹکاتا ہے۔ ناچ دیکھتا ہے۔ بری کتابیں پڑھتا ہے۔ آپ سب بالکل سچ کہتے ہیں۔ احمد سعید بڑا ہی شیطان ہے۔''

ابھی آنکھ نہ جانے کتنی دیر پھڑک پھڑک کر شکایت کرتی کہ کان بول اٹھا:

''ساتھیو! بالکل ٹھیک، میرا حال بھی بالکل تمہاری طرح ہے۔ جب یہ دیکھتا ہے کہ اچھی باتیں میرے اندر آ رہی ہیں تو مجھ میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے۔ بری باتیں، گالیاں، جھوٹی باتیں سننا اسے بہت ہی پسند ہیں......۔''

کان اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ میاں پیٹ ''اُف اللہ اُف اللہ'' کر کے بولے:

''بھائیو! ذرا میری طرف دیکھو۔ میں تو تم سب سے زیادہ سعید سے

گھبرا گیا ہوں۔ رات دن انگاروں سے مجھے بھرا کرتا ہے۔ حرام حلال کی اسے پروانہیں۔ چوری کے لڈّو ہوں چھین جھپٹ کی ریوڑیاں ہوں، دھوکہ دے کر لائی ہوئی ٹافی ہو۔ اس کو یہ فکر نہیں کہ ایسی کمائی سے اللہ میاں ناخوش ہوتے ہیں۔ نہ یہ پروا کہ ایسے کاموں سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ کھانے کو ملے پیٹ بھرے۔ بھائیو! مجھ سے تو اب اس کا کہنا مانا نہیں جاتا۔ مگر کیا کروں؟ اکیلا ہوں۔ اکیلا چنا بھاڑ کو کیسے پھوڑ سکتا ہے۔''

میاں پیٹ چپ ہوئے تو دل اور دماغ نے اسی طرح کی باتیں کیں۔ اور پھر رونگھٹا رونگھٹا یہی رونا رونے لگا۔ زبان ابھی تک چپ تھی۔ سب سے آخر میں وہ چہکی۔ ''ارے تو پھر اس طرح رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ کر ڈالو نہ کوئی فیصلہ۔ اور ہاں میاں دل اور دماغ صاحب! ہم میں تم ہی سمجھدار ہو۔ آپس میں صلاح کر کے بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

زبان اس طرح چٹکی تو دل نے دماغ کی طرف دیکھا۔ دماغ نے دل کی طرف اور پھر دل نے زبان کی طرف اشارہ کیا۔ اور زبان پکار اٹھی:

''بائیکاٹ، ہڑتال!''

زبان نے یہ اعلان کیا تو ایک دم سنّاٹا چھا گیا۔ اور اس سنّاٹے کے ساتھ میری نظروں کے سامنے اندھیرا اچھل گیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کچھ دیکھوں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوشش کرتا ہوں لیکن کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

آنکھ کی یہ حالت دیکھی تو میں نے چاہا کہ ہاتھ کے سہارے سے اٹھوں۔ ارے بھائی! میں اٹھتا ہی کیا میرا ہاتھ ہی نہ اٹھ سکا۔ جیسے سُن ہو جاتا ہے نا! اس سے بھی بُری حالت ہوگئی اس کی۔

اب میں نے چاہا پیر سمیٹوں۔ تو ایسا لگا کہ جیسے پیروں کی جان نکل گئی۔ میں نے چاہا کہ ابا جان کو پکاروں لیکن زبان ہے کہ چپ۔ مجھ سے چلائی ہی نہیں گئی۔ میں نے سوچا کہ ناک سے زور زور سے سانس لوں تو شاید ابا جان سنیں تو مجھے اٹھائیں۔ لیکن اب سانس ہی نہیں آرہی تھی۔ اور اس طرح ایک ایک کر کے میرے جسم کا رُواں رُواں بے کار ہوگیا۔ اور آخر میں میرے اندر سوچنے کی طاقت بھی نہ رہی۔

پھر مجھے ایسا لگا۔ جیسے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ سب خواب میں ہوتا رہا۔ جاگا تو سوچنے لگا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ سچ مچ میرے ہاتھ، پیر، آنکھ، کان، دل اور دماغ کو یہ اختیار دے دے کہ وہ اسی طرح میرا بائیکاٹ کر دیں۔ جس طرح خواب میں دیکھا تو میرا کیا حال ہو۔

اُف اللہ! میں کچھ بھی تو نہ کر سکوں۔ نہ دیکھ سکوں، نہ کچھ کھا سکوں، نہ پی سکوں، نہ کھیل سکوں، نہ پڑھ سکوں نہ لکھ سکوں۔ یہ سوچتے سوچتے میں نے اپنے روئیں روئیں کو دیکھا خدا کا شکر ہے۔ اب میں جاگ رہا تھا اور میرے ہاتھ پیر سب اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ لیکن دل نے آواز دی:

’’میاں سعید! آپے میں رہو۔ اتنا خوش نہ ہو۔ خوشی میں اتنا نہ پھولو کہ پیٹ پھٹ جائے۔ آج تم ہم سب پر مالک بنا دیئے گئے ہو تو کیا ہوا۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ جب تم اللہ میاں کے سامنے کھڑے کئے جاؤ گے۔ اُس وقت تمہارے سارے کرتوت سب کے سامنے ہوں گے۔ تم سے ایک ایک کام کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔ اور اس وقت ہم سب تمہارے خلاف اسی طرح گواہی دیں گے۔

دل نے مجھ سے اس طرح کہا تو میں کانپنے لگا۔ میں پسینے پسینے ہو گیا۔ پھر میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔ گھر والے حیران ہو گئے کہ سعید کو کیا ہو گیا ہے۔ سب پوچھنے لگے کیا ہوا، کیا ہوا؟

میں نے امی جان اور ابا جان کو آپ بیتی سنائی۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ جو کام کروں اللہ کی مرضی کا کروں۔

☆☆☆

مال دار کون؟

ایک آدمی تھا۔ اس کے دو ہاتھ تھے، دو پیر تھے، دو آنکھیں تھیں، دو کان تھے۔ اچھا خاصا ڈیل ڈول تھا۔

''ہی ہی ہی......!'' آج بھائی جان نے اس طرح کہانی شروع کی تو ہم سب ''ہی ہی ہی'' کر کے ہنسنے لگے۔ رجّو آپا بولیں۔ ''یہ کیسی ہے کہانی؟ ہاتھ، پیر، آنکھیں اور کان تو آدمی کے ہوتے ہی ہیں۔''

یہی تو سوچ کر ہم سب بھی ہنس رہے تھے۔ بھائی جان نے ہمیں دیکھا۔ وہ خود بھی ہنسنے لگے۔ پھر بولے: ''کہانی تو سنو، بڑی مزے دار ہے۔''

''اچھا بھائی! سنایئے۔''

''اچھا سنیئے۔ وہ جوان آدمی کام دھام تو کرتا نہ تھا۔ شام کو جامع مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور بھیک مانگا کرتا تھا۔

''بھائی جان! آپ اسے جانتے تھے کیا؟'' سعید نے پوچھا۔

''جانتا تو نہ تھا مگر جان گیا۔''

''وہ کیسے؟'' سعید نے پھر پوچھا۔

''ایسے کہ ایک دن میں مغرب کی نماز پڑھ کر جامع مسجد سے نکل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کار آ کر رکی۔ وہ کار کی طرف دوڑا۔ کار میں ایک آدمی تھا۔ وہ رئیس معلوم ہوتا تھا۔ کسی کام کے لئے اس نے باہر جھانکا تو جوان بھکاری نے اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔ رئیس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر بولا: ''شرم نہیں آتی۔ یہ جوانی، یہ ڈیل ڈول اور بھیک مانگ رہے ہو۔''

''حضور! غریب آدمی ہوں۔ خدا کے نام پر کچھ دے دیجئے۔''

''تم غریب ہو، اللہ نے دو ہاتھ دیئے، دو پیر دیئے، آنکھیں اور کان دیئے اور یہ گٹھا ہوا بدن دیا۔ پھر بھی اپنے کو غریب بتاتے ہو۔ تم تو جو چاہو کر سکتے ہو۔ مجھے دیکھو، غریب تو میں ہوں۔

یہ کہہ کر اس رئیس نے اپنا لولا ہاتھ اور لنگڑی ٹانگ دکھائی اور کہا کہ اس کی ایک آنکھ نقلی لگی ہے۔ پھر کہنے لگا۔

''دس ہزار روپئے لے لو۔ اپنی ایک ٹانگ دے دو۔ جوان بھکاری چپ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میں بھی کار کے پاس جا پہنچا اور ان کی باتیں سننے لگا۔

''ارے واہ! شوکت باجی کو مزا آنے لگا۔ بولیں: ''ارے واہ! پھر تو بھکاری کچھ جواب نہ دے سکا ہوگا۔''

''جواب کیا دیتا۔'' رئیس نے پھر کہا۔ ''اچھا بیس ہزار لے لو اور اپنا ایک ہاتھ مجھے دے دو۔''

''واہ بھئی واہ۔'' رجّو آپا کہنے لگیں۔ ''اب تو وہ نوجوان کچھ بھی نہ بول سکا ہوگا۔''

''ہاں، سنو تو۔ اس سے رئیں نے پھر کہا۔ ''اچھا تو چالیس ہزار روپئے لے لو اپنی آنکھ مجھے دے دو۔''

بھکاری چپ کھڑا تھا۔ اس سے کوئی جواب بَن نہیں پڑ رہا تھا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ رئیس نے کہا۔ ''اچھا لے، یہ ایک روپیہ لے۔ لیکن یاد رکھ!

خدا جسے ذلیل کرنا چاہتا ہے اس سے بھیک منگواتا ہے۔ یہ بات پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اب تو جانے اور تیرا ایمان۔"

"تو پھر اس نے روپیہ لے لیا؟" میں نے بھائی جان سے پوچھا۔ بھائی جان نے کہا:

"نہیں اس نے روپیہ نہیں لیا۔ وہ چپ چاپ ایک طرف چلا گیا۔"

"ارے واہ، خوب۔ پھر تو اس نے بھیک مانگنے سے توبہ ہی کر لی ہو گی۔ ہے نا بھائی جان!"

"ہاں سچ مچ، اس نے پھر بھیک نہیں مانگی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" رجّو آپا نے سوال کیا۔ بھائی صاحب نے بتایا کہ ایک دن میں دفتر جا رہا تھا۔ راستے میں ایک نیا مکان بن رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہی جوان وہاں اینٹیں اٹھا رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ اُس نے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے دیکھا۔ ہم دونوں مسکرائے۔

"ہاں مسکرائے تو ہوں گے آپ دونوں۔"

پھر آپس میں سلام علیک ہوئی۔ میں نے پوچھا:

"کہو بھائی! کتنے کی مزدوری کر لیتے ہو؟"

بولا: "میں مزدوری نہیں کرتا۔ ٹھیکے پر کام کرتا ہوں۔ ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ ہزار چوکے اٹھا کر اندر چٹا لگا دیتا ہوں۔ تیس چالیس روپیہ

روز کی کما لیتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تندرست بنایا۔ اب میں اپنے آپ کو غریب نہیں سمجھتا۔ مجھے اللہ نے بڑا مال دار بنایا ہے۔ مجھے یہ ہٹا کٹا تندرست بدن کیا دیا، سمجھئے کہ بہت بڑی دولت ہے یہ۔ پہلے میں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس دن تو آپ وہاں موجود تھے۔ اُس لنگڑے رئیس نے میری آنکھیں کھول دیں۔''

''ارے تم سب چپ کیوں ہو؟ کہانی کہتے کہتے بھائی جان نے ہم سے کہا۔

ہم سچ مچ چپ تھے۔ اور چپ ہی رہے۔ بھائی جان کہنے لگے۔

''اچھا تمہیں تعجب ہو رہا ہے۔ اچھا لو اور زیادہ تعجب کرو یا پھر نصیحت حاصل کرو۔''

وہ جو میرے دوست احمد یار خاں صاحب ہیں نا! حامد میاں تم تو ایک دن میرے ساتھ ان کے محل میں گئے تھے۔ کیسا اچھا بنا ہے اُن کا محل۔ وہی تو تھے، وہ جوان بھکاری۔ جن کا حال میں نے سنایا۔

''ارے واہ! احمد یار خاں صاحب۔'' ہم سب ہکّا بکّا ہو کر رہ گئے۔ اور پھر اپنے اپنے ہاتھ پیر دیکھنے لگے۔ ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہمارے سارے بدن میں ایک طاقت بھر گئی ہے۔ بھائی جان مسکرائے اور اپنے کام میں لگ گئے۔

☆☆☆

ایک انسان دو جنّ

جنّوں کے بادشاہ نے جنّوں کے سامنے انسان کی تعریف کی تو سب سے زیادہ جھن جھن جنّی اور گھن گھن جنّی کو بُرا لگا۔ وہ اپنی اپنی جگہ بڑبڑانے لگے۔ واہ، ذرا سا انسان، ہم جب چاہیں، اُسے مٹھی میں دبا کر مار ڈالیں۔ ہم آگ سے بنے ہیں، انسان مٹی سے۔ ہم میں وہ طاقت ہے کہ ہم پہاڑ اٹھا لیں۔ ہمارے سامنے آدمی ایسا ہے جیسے پہاڑ کے سامنے چیونٹی۔ واہ، یہ بھی خوب رہی کہ بادشاہ سلامت انسان کو ہم سے بڑھ کر بتاتے ہیں۔ ہم میں تو یہ طاقت ہے کہ ہم شیر بن کر آدمی کو ڈرا دیں۔ ہم میں یہ طاقت ہے کہ ہم آدمی کے جسم میں گھس کر بیماریاں پیدا کر دیں۔ ہم یہ بھی تو کر سکتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا دیں۔ بھلا یہ انسان ہم سے بڑھ کر کیسے ہو سکتا ہے؟

جھن جھن جنّی اور گھن گھن جنّی کی بڑبڑاہٹ بادشاہ نے بھی سنی۔ وہ دونوں کو سمجھانے لگا کہ ''خبردار! آدمی کا مقابلہ نہ کرنا۔ اللہ نے اس کو سب سے زیادہ سمجھ دی ہے۔ آدمی دیکھنے ہی میں چھوٹا ہے مگر سمجھ لو وہ علم اور عقل کا پتلا ہے تم اس سے جیت نہیں سکتے!''

جھن جھن جنّی اور گھن گھن جنّی نے بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور مقابلے کر کے

دیکھ لیجئے آپ کہئے تو ہم اس کی مفت نوکری کر کے ناک میں اس کا دم کر دیں۔

"اچھی بات ہے۔" جنّوں کے بادشاہ کو دونوں کی گھمنڈ بھری باتیں پسند نہیں آئیں۔ اس نے کہا۔ "اچھا جاؤ ایک آدمی کو اٹھا لاؤ۔ جھن جھن جنّی اور گھن گھن جنّی آن کی آن میں ایک آدمی کو اٹھا لائے اور بادشاہ کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔

بادشاہ نے جنّوں کو حکم دیا کہ سب لوگ آدمی کی شکل بن جاؤ۔ ویسے تو آدمی ہمیں دیکھ نہیں سکتا۔ اس کے بعد تمہارا اور اس کا مقابلہ ہو گا۔

بادشاہ کے حکم سے سارے جنّ آدمی کی شکل میں آ گئے اور اب آدمی نے دیکھا کہ وہ ایک دربار میں ہے اور سامنے بادشاہ بیٹھا ہے اور آس پاس بڑے بڑے ڈیل ڈول کے لوگ بیٹھے ہیں۔ آدمی ڈرا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیسے آ گیا۔ اور کیوں لایا گیا ہے؟ اس نے بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے اس سے کہا۔

دیکھو، ہم سب جنّ ہیں۔ تم ہمیں ویسے تو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ہم سب آدمی کی شکل میں تمہارے سامنے آ گئے۔ ادھر دیکھو، وہ دو جنّ تم کو اٹھا لائے ہیں۔ وہ تمہاری نوکری مفت کریں گے۔ تم کو یہیں ایک مکان رہنے کو دیا جائے گا۔ اگر تم نے ان سے نوکری کرا لی تو تم کو انعام دے کر واپس کر دیا جائے گا نہیں تو یہ دونوں جنّ تم کو کھا جائیں گے۔"

بے چارہ آدمی بڑا پریشان ہوا۔ پھر سوچنے لگا کہ یہ کیا بات ہے۔ جنّ میری نوکری کریں گے اور مفت میں۔ اس نے سوچ کر بادشاہ سے کہا: ''جو آپ کی مرضی ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ دونوں میرا کہنا نہیں ٹالیں گے۔'' بادشاہ نے کہا۔ ''ہاں، یہ دونوں وہی کریں گے جو تم کہو گے۔'' لو بھئی یہ بات طے ہو گئی۔ بادشاہ نے آدمی کو رہنے کے لئے ایک مکان دے دیا۔

آدمی جھن جھن جنّی اور گھن گھن جنّی کے ساتھ مکان میں گیا۔ دونوں کو حکم دیا۔ ''مکان صاف کرو۔'' جنّوں نے منٹ بھر میں مکان صاف کر دیا۔ پھر حکم دیا۔ ''کمرے سجاؤ۔'' جنّوں نے منٹ بھر میں کمرے سجا دیئے۔ پلنگ، کرسی، میز اور ہر طرح کا سامان لیس کر دیا اور آ کر بولے۔ ''اب کیا حکم ہے؟''

آدمی نے کہا۔ ''اب جاؤ، کھانا لاؤ۔'' جنّوں نے منٹ بھر میں طرح طرح کا کھانا حاضر کر دیا۔ آدمی کھانا کھانے لگا اور جنّ بولے۔ ''اب کیا حکم ہے، ہم سے کام لو۔'' اب تو آدمی سوچنے لگا کہ ان سے کیا کام لے۔ اس نے حکم دیا۔ ''جاؤ کشمیر سے سیب لے آؤ۔'' دونوں نے منٹ بھر میں کشمیر کے سیب لا کر حاضر کیئے اور بولے۔ ''اب کیا حکم ہے ہم سے کام لو۔'' آدمی نے پھر سوچ کر کہا۔ ''اچھا اب جاؤ امریکہ سے دودھ کا ڈبّہ لے آؤ۔'' یہ کہہ کر آدمی نے لقمہ منہ میں ڈالا۔ ابھی لقمہ چبا کر نگلا نہیں تھا کہ دونوں امریکہ سے دودھ کا ڈبّہ لے آئے۔ اور بولے۔ ''اب کیا حکم ہے ہم سے کام لو۔''

اب تو آدمی پریشان ہونے لگا۔ دل میں سوچا کہ اتنی جلدی یہ کام کریں گے تو ناک میں دم کر دیں گے۔ مگر کام تو لینا ہی تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اب جاؤ مکّے سے زمزم کا پانی لے آؤ۔'' دونوں جنّ منٹ بھر میں زمزم کا پانی لے آئے اور پھر کام کی رٹ لگا دی۔ آدمی سوچنے لگا۔ اب معلوم ہوا کہ مجھے مشکل میں پھنسا دیا گیا ہے۔ جیسے تیسے دن بھر تو وہ کام بتاتا رہا۔ رات کو سونے چلا تو جنّوں نے کہا۔ ''کام بتایئے۔'' آدمی نے کہا۔ ''اب تو میں سونے جا رہا ہوں۔ اب کام کیسا؟'' جنّوں نے کہا۔ ''یہ ہم کچھ نہیں جانتے، کام بتاؤ۔'' اب تو آدمی ان سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب سوچنے لگا۔

آدمی سوچتے سوچتے اُکتا گیا۔ تو اس نے خدا سے دعا کی کہ ''اے اللہ! ان سے پیچھا چھُڑا۔'' دعا کے بعد اس نے ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' پڑھی۔ اپنے اوپر دم کیا۔ جیسے ہی اس نے دم کیا۔ ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے جھن جھن جنّی سے کہا۔ ''تم جا کر چالیس پچاس گز کا ایک بانس لے آؤ۔' گھن گھن جنّی سے کہا۔ ''تم جا کر ایک کتّا لے آؤ۔'' دونوں جنّ منٹ بھر میں لے آئے اور بولے۔ ''کام بتاؤ۔'' آدمی نے جھن جھن جنّی کو حکم دیا کہ یہ بانس گاڑ دو اور اس پر چڑھو اترو۔ جب تک میں دوسرا حکم نہ دوں یہی کام کرتے رہو۔ گھن گھن جنّی کو حکم دیا کہ ''تم اس کتّے کی دُم سیدھی کرو۔ جب

دُم سیدھی ہو جائے تو مجھے دکھاؤ۔''

دونوں جنّ اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ جھن جھن جنّی نے بانس گاڑا اور اس پر چڑھنے اترنے لگا۔ گھن گھن جنّی کتّے کی دُم سیدھی کرنے لگا۔ وہ دُم پکڑ کر کھینچتا تو کتّا بھونک کر کاٹنے دوڑتا۔ گھن گھن جنّی دُم چھوڑ دیتا تو کتّا کبھی دُم نیچے کر کے پچھلی ٹانگوں کے بیچ میں لے جاتا اور کبھی اوپر اٹھا دیتا۔

آدمی یہ دیکھ کر مسکرایا۔ اب وہ چین سے پڑ کر سونے لگا۔ جھن جھن جنّی رات بھر بانس پر اترتا چڑھتا رہا۔ وہ چڑھتے اترتے تھک گیا۔ گھن گھن جنّی بار بار کتّے کی دُم سیدھی کرتا۔ لیکن جب چھوڑتا تو دُم ٹیڑھی ہی رہتی۔ صبح کو جب آدمی جاگا تو اس نے دیکھا کہ جھن جھن جنّی بانس پر بہت سستی سے چڑھ اتر رہا ہے اور گھن گھن جنّی کتّے کی دُم سیدھی نہ کر سکا۔ وہ دونوں پر بہت خفا ہوا۔ سڑاک سڑاک دس بیس بید لگائے۔ اس کے بعد پانی کھانا اور دوسری چیزیں مانگیں۔ دونوں نے ضرورت کی سب چیزیں حاضر کر دیں اور چاہا کہ ذرا سستا لیں کہ آدمی نے حکم دیا۔ ''ہاں! پھر اپنے کام پر چالو ہو جاؤ۔'' جھن جھن جنّی پھر بانس پر چڑھنے اترنے لگا اور گھن گھن جنّی کتّے کی دُم سیدھی کرنے لگا۔

آدمی کھا پی کر کپڑے پہن رہا تھا کہ جنّوں کے بادشاہ کے دربار میں جائے۔ اتنے میں جنّوں کا بادشاہ اپنے وزیروں اور درباریوں کے ساتھ خود اس کے گھر آ گیا۔ جھن جھن جنّی کو دیکھا وہ چڑھتے اترتے بے دَم ہو رہا تھا۔ پسینے میں

شرابور، اور گھن گھن جنّی کتّے کی دُم سیدھی کرنے میں جھنجھلایا ہوا تھا۔ بادشاہ نے دونوں کی خیریت پوچھی۔ دونوں نے کہا۔ ''حضور! آپ ٹھیک کہتے تھے۔ ہم بھر پائے۔ یہ آدمی سچ مچ علم اور عقل کا پُتلا ہے۔ پہلے تو ہم نے اسے پریشان کردیا۔ اس کا سونا دوبھر کردیا۔ لیکن پھر اس نے کچھ پڑھا۔ اپنے اوپر دم کیا۔ تو جھٹ یہ حکم دیا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ سچ مچ آپ سچ کہتے تھے۔ اللہ نے آدمی کو سب سے بڑھ کر بنایا اور اسے عقل سب سے زیادہ دی۔ اب خدا کے واسطے اس سے ہمارا پیچھا چھڑائیے۔ نہیں تو ہم دونوں اس کا حکم مانتے مانتے مر ہی جائیں گے۔''

بادشاہ ہنسا۔ اس نے آدمی سے کہا۔ ''بھائی! تم جیت گئے۔ ان دونوں نے اپنے گھمنڈ کی سزا پائی۔ اچھا، اب تم کو تمھارے گھر بھیج دیا جائے گا۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے آدمی کو بہت کچھ انعام دیا اور جھن جھن جنّی اور گھن گھن جنّی کو حکم دیا کہ اس آدمی کو جہاں سے لائے ہو وہیں واپس کر آؤ۔''

دونوں جنّوں نے بادشاہ کے حکم کو سنا۔ اطمینان کا سانس لیا۔ منٹ بھر میں آدمی کو سامان کے ساتھ اس کے گھر چھوڑ آئے۔ پھر کبھی انھوں نے آدمی سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کی۔ ہمت کرنا تو الگ رہا۔ وہ تو اپنی قوم کے لوگوں کو نصیحت کرتے تھے کہ بھائی! انسان کو اللہ نے سب سے بڑھ کر بنایا ہے۔ اس سے کبھی نہ بھڑنا۔

☆☆☆

جوان بلّی

جوان بلّی نے پوچھا۔ ''بُوا! تمہارے ساتھ یہ کون ہے؟''

بوڑھی بلّی نے بتایا: ''یہ صفّو ہے۔ میری مالکن کی بیٹی۔ بڑی اچھی بیٹی ہے یہ۔''

''کیا کرتی ہے یہ؟''

''یہ قرآن پڑھتی ہے۔ نماز پڑھتی ہے۔ اپنی امی کا کہنا مانتی ہے۔ مجھے دودھ پلاتی ہے، گوشت کھلاتی ہے، اپنے پاس سلاتی ہے۔''

''ارے! اور تم اس کے پنجہ نہیں مار دیتیں، کاٹ نہیں لیتیں۔''

''میں اسے پنجہ کیوں ماردوں، کاہے کو کاٹوں؟''

''آخر ہو تو بلّی تم بھی!''

''اس سے کیا ہوتا ہے، پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سٹھیا گئی ہو!'' یہ بات نہیں۔ صفّو کی امی نے اِتنّے سے مجھے پالا ہے۔''

''اچھا اب سمجھی میں۔ اس گھر کی روٹیاں کھاتے کھاتے تمہاری عادت بدل گئی۔''

''ہاں میں بھی اچھی باتیں سیکھ گئی۔''

’’اونھ، میں کیا کہتی ہوں اور تم کیا سمجھتی ہو۔ میں کہتی ہوں کہ تمہاری جگہ میں ہوتی تو کم سے کم اس صفّو کے گال نوچ کر چٹ کر جاتی۔ دیکھو تو کیسے پھولے پھولے اور لال لال ہیں اس کے گال۔‘‘

’’اری ہٹ! بڑی آئی چٹ کرنے والی۔ ہم بلّیوں کا انسانوں سے کیا مقابلہ۔ اللہ نے انسانوں کو ہم سے بڑھ کر بنایا ہے۔‘‘

’’واہ! یہ تم نے خوب کہی۔ تم ایسا کیوں سمجھتی ہو۔ میں تو انسانوں سے نہ دبوں۔‘‘

’’ایک دن میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی، پر مجھ پر پھٹکار پڑ گئی۔ تب سے میں سمجھتی ہوں کہ اللہ نے انسان کو دنیا کی سب چیزوں سے بڑھ کر بنایا ہے۔‘‘

’’وہ کیسے؟ ذرا مجھے بھی کچھ حال سناؤ۔‘‘

’’سنو، یہ تو میں بتا ہی چکی کہ میں بالکل چھوٹی تھی کہ صفّو کی امی مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ یہ صفّو بھی اس وقت ایسی ہی تھی، جیسی میں۔ صفّو دودھ پیتی، روتی اور سوتی، یہ تین کام تھے اس کے۔ میں دودھ پیتی، چھیچھڑے چٹ کرتی اور میاؤں میاؤں کرتی۔

جب ذرا بڑی ہوئی، یہ صفّو اور میں بھی۔ تو ایک دن کھیل کھیل میں صفّو نے میری دُم پکڑ کر کھینچی۔ میں نے اس کے پنجہ مار دیا۔ تو پھر صفّو رونے لگی۔ امی

دوڑیں۔ صفّو کے خون نکل آیا تھا۔ میں بیٹھی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ میں امی سے کہہ رہی تھی کہ صفّو نے میری دُم پکڑی۔ میں دُم چھڑانے لگی تو میرے ناخن لگ گئے۔ امی میری بات سمجھ گئیں اور صفّو کو نصیحت کرنے لگیں کہ دیکھو بیٹی صفّو! دُم نہ پکڑنا بلّی کی ورنہ نوچ لے گی۔"

یہ سنا تو مجھے گھمنڈ آ گیا۔ میں سمجھ گئی کہ اگر میں چاہوں تو صفّو کو، امی کو، بڑی باجی کو، چھوٹی اپیا کو سب کو پنجہ مار سکتی ہوں۔

بس تو اب اگر صفّو مجھ سے کہتی۔ "یہاں آؤ۔" تو میں دوسری طرف جاتی۔ اپیا کہتیں۔ "ادھر چل۔" تو میں دوسری طرف صندوق کے نیچے جا گھستی۔ مطلب یہ کہ میں کسی کا کہنا نہیں سنتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں سب کو پریشان کرنے لگی۔ تو ایک دن امی نے مجھے بٹھا کر سمجھانا شروع کیا۔ میں نے سنی اَن سنی کر دی۔ اس وقت تم جیسی باتیں کر رہی ہو نا! بالکل اسی طرح زبان لڑا بیٹھی اور کہا کہ کیا میں کسی سے کم ہوں۔ جو دب کر رہوں۔"

امی جان نے اپنے احسانات گنائے۔ بولیں: "اری پوسی! دیکھ میں تجھے دودھ پلاتی ہوں، گوشت کھلاتی ہوں، بستر پر سلاتی ہوں، تو کیسی حرام خور ہوتی جا رہی ہے۔"

میں نے میاؤں کر کے جواب دیا۔ "تم دودھ نہ پلاؤ گی تو کیا ہوا، چوہے

کیا کم ہیں میرے لئے۔''

امی جان کو غصہ آ گیا۔ انہی دنوں امی کے گھر کے چوہوں نے میٹنگ کی تھی کہ میرے گلے میں گھنٹی باندھ دیں ان کا مطلب یہ تھا کہ گھنٹی کی آواز سے وہ سمجھ جائیں گے کہ بی خالہ آ گئیں، بھاگو۔''

تو سن رہی ہو تم۔ چوہے میٹنگ کر رہے تھے۔ سوال یہی تھا کہ بی خالہ کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ میں سن گن پا گئی، جھپٹی۔ سارے کے سارے دُم دبا کر بھاگے۔ میں خوب ہنسی۔

اچھا تو چوہے اڑنچھو ہو گئے۔ گھنٹی وہیں کی وہیں پڑی رہ گئی۔ امی جان نے وہی گھنٹی میرے گلے میں باندھ دی اور میرا راطب بند کر دیا۔

میں تو اپنے گھمنڈ میں تھی۔ دل میں کہا۔ نہ دو، دودھ اور چھیچھڑے۔ میں چوہے کھاؤں گی۔ مگر اب جو چوہوں کی کھوج میں چلی تو میرے آگے بڑھنے سے پہلے ٹن ٹن ٹن ٹن کی آواز دور دور پہنچنے لگی۔ اب چوہے مجھے دور ہی سے چڑانے لگے۔ منہ بنانے لگے۔ زور زور سے کہتے: ''خالہ بی! ہم یہاں ہیں۔'' میں اِدھر اُدھر ان کو پکڑنے دوڑتی پھرتی مگر وہ جو ٹن ٹن ہوتی تو پہلے سے سارے کے سارے چوہے بلوں میں جا گھستے۔

میں نے سوچا اس گھر کے چوہے چالاک ہو گئے۔ دوسرے گھر میں چلو۔

دوسرے گھر میں جانے کے لئے دروازے سے نکل رہی تھی کہ ٹن ٹن سن

کر گلی کا کتّا چونکا۔ مجھے دیکھا تو غرّا کر جھپٹا۔ میں بھاگ کر چھت پر چڑھ گئی۔ وہاں سے دوسرے گھر میں کود گئی۔ مگر ٹن ٹن کی آواز سے اس گھر کے لوگ دوڑے۔ اس گھر کے چوہے بھی بھاگ گئے۔

اس طرح تین دن فاقے سے گذرے، اب میں کتّوں کے ڈر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ گھر میں چوہے ہوشیار ہو چکے تھے۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چوری کر کے صفّو کا دودھ اڑاؤں۔

اچھا تو سنو۔ ایک دن امی جان نے صفّو کے لئے دودھ رکھ دیا الماری میں۔ میں تو جانتی ہی تھی۔ باورچی خانے کی طرف چلی تو ٹن ٹن باورچی خانے میں ہوئی تو امی ڈنڈا لے کر دوڑیں۔

میں بھوک کے مارے مری جا رہی تھی۔ میں نے امی جان کو ڈنڈا لئے دیکھا تو ہار مان لی۔ لگی میاؤں میاؤں کرنے۔ میں نے کہا: ''امی جان! معاف کیجئے، میں گھمنڈ میں آ گئی تھی۔ اب میں آپ کا کہنا مانوں گی۔'' امی جان کو ترس آ گیا۔ وہ مسکرائیں۔ انھوں نے میرے گلے سے گھنٹی کھول دی۔ دودھ دیا۔ دودھ میں نے پیا۔ وہیں کونے میں چوہے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ چلو گیہوں کا بورا کاٹیں اور مزے اڑائیں۔ میں نے سن لیا۔ میں ہنسی۔ کونے کی طرف جھپٹی تو۔ ارے چوں، کہہ کر سب بھاگے، سب نڈر تو تھے ہی۔ مگر اب گھنٹی میرے گلے میں کہاں تھی۔ دو کو دھر دبوچا اور چٹ کر گئی۔

تو......سنا تم نے۔ بس اس دن سے میں سمجھ گئی کہ انسان کو اللہ نے ہم سب سے بڑھ کر بنایا ہے۔ میں نے تب سے گھمنڈ نہیں کیا۔ اور دیکھو، اگر تم گھمنڈ کرو گی تو بھگتو گی۔''

بوڑھی بلّی نے جوان بلّی سے یہ کہا اور صفّو کے ساتھ ایک طرف چل دی۔ جوان بلّی دونوں کو دیر تک دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بوڑھی بلّی نے سچ ہی کہا۔

☆☆☆

بجلی کہاں گری؟

پُرانا امام باڑہ آج کل سونا پڑا ہے۔ اس کا ایک طرف کا حصہ گر گیا ہے۔ دوسری طرف دو حجرے ہیں۔ ان میں سے ایک پچھلی برسات میں گر گیا۔ اس میں ایک بوڑھیا رہا کرتی تھی۔ ان دونوں حجروں کے سامنے ایک گنبد نما عمارت بنی ہے۔ اس عمارت کی کرسی اتنی اونچی ہے کہ اس پر جانے کے لئے زینہ بنا ہے۔ اس عمارت کے گنبد پر کلس لگا ہوا تھا۔ پچھلی برسات میں اس کلس پر بجلی گری۔ پھر جو کچھ ہوا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اکبر میرا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی اسکول میں اور ایک ہی درجے میں پڑھتے تھے۔ ماسٹر صاحب ہوم ورک کے لئے جو کچھ دیتے۔ ہم اسی گنبد نما عمارت میں جا کر کیا کرتے

تھے۔ پچھلی برسات میں ایک دن ہوم ورک کرتے کرتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ مغرب کے وقت بادل گھِر آئے۔ پانی برسنے لگا۔ بجلی کڑکنے لگی۔

ہم نے دیکھا، سامنے امام باڑے کے ایک حجرے میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ایک بوڑھیا حجرے کا سامان کبھی ایک طرف رکھتی، کبھی دوسری طرف۔ حجرہ ٹپک رہا تھا اور بوڑھیا اپنا سامان پانی سے بچاتی پھرتی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پانی برسا پھر رک گیا۔ اچانک اڑا، اڑا دھڑام دیوار گرنے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے بوڑھیا کے حجرے کی طرف دیکھا۔ اس حجرے کی ایک طرف کی دیوار گر گئی تھی، اور بوڑھیا کا آدھا جسم اینٹوں کے اندر دب گیا تھا۔ بوڑھیا بے چاری مدد کے لئے چیخ رہی تھی۔ میں نے اکبر سے کہا:

''یار! اس وقت ہمیں چاہئے کہ اس بوڑھیا کی جان بچائیں۔'' یہ سن کر اکبر نے جواب دیا۔ ''میں تو ایسی اندھیری رات میں یہاں سے ہٹ کر نہ جاؤں گا۔'' میں نے اسے بہت سمجھایا۔ ثواب کا لالچ دیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بوڑھیا چلاّئے جا رہی تھی۔ آخر میں اکیلا ہی چل دیا۔ جا کر بوڑھیا کے اوپر سے اینٹیں ہٹانے لگا۔ بجلی کڑکتی تو دل دہل جاتا۔ میں نے دس پندرہ منٹ میں بوڑھیا کو نکال لیا۔ بوڑھیا کو نکال کر سوچنے لگا کہ اسے کہاں لے جاؤں اور کیسے لے جاؤں؟ میں نے اکبر کو پکارا۔ ''یار! اب تو آجاؤ، گھر تو چلنا ہی ہے آؤ، اس بوڑھیا کو لاد لے چلیں۔''

اکبراب بھی نہ آیا۔ وہیں سے بولا۔ ''تم ہی یہ ثواب لو۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک بادل نہ چھٹ جائیں۔'' اکبر یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بجلی کڑکی۔ گنبد نما عمارت کے کلس پر گری اور نیچے اترتی چلی گئی۔ اس نے عمارت میں دراڑیں ڈال دیں۔ بجلی کے گرتے ہی اکبر ہائے کر کے گرا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ دیکھا تو اکبر مر چکا تھا۔ اس کا سارا جسم جھلس کر کالا پڑ گیا تھا۔ اب میں ایک زخمی کے ساتھ ایک لاش کو بھی لے جانے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ماسٹر تیمور لنگ

پیارے بچو! ایک دن وہ تھا کہ میں بھی تمہاری طرح بچہ تھا۔ اب تو بڑا ہو گیا ہوں۔ اتنا بڑا جتنے بڑے تمہارے چچا میاں ہیں۔ تم اپنے چچا میاں سے بڑی اچھی اچھی، بڑی ہی نصیحت بھری کہانیاں سنتے ہو۔ کیا تم میری نصیحت بھی سنو گے؟ یہ بات میں تم سے اس لئے کہتا ہوں کہ میں تم کو بہت اچھا، بہت ہی اچھا سمجھتا ہوں کہ اچھے بچے اپنے بڑوں کی نصیحت کو دل کے کانوں سے یعنی بڑے دھیان سے سنتے ہیں۔

اچھا تو سنو، جس طرح چچا میاں ہر نصیحت کی کہانی بنا کر تم کو سناتے ہیں۔

اسی طرح میں بھی کہانی ہی کہانی میں تم کو نصیحت کروں گا، اچھا تو سنو۔

ایک تھے ماسٹر تیمور لنگ صاحب، تیمور لنگ کے نام پر تم ہنسے کیوں؟ اچھا اب سمجھا۔ تم نے اس بادشاہ کے بارے میں ضرور پڑھا ہو گا جو لنگڑا تھا۔ وہ لنگڑا بادشاہ اتنا مشہور ہوا کہ اب جو آدمی بھی لنگڑا ہوتا ہے، تو اسے چڑانے کے لئے لوگ تیمور لنگ کہنے لگتے ہیں۔ کیونکہ اس بادشاہ کا نام تیمور تھا۔

تم جانو کسی کو چڑانا، کسی کی نقل اتارنا اچھا نہیں ہوتا۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ جو شخص کسی کو چڑاتا ہے یا اس کی نقل اتارتا ہے اس سے اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اللہ میاں ایسے آدمی کو اس دنیا میں بھی سزا دیتے ہیں۔ یہی بات تو میں تم کو سناؤں گا۔

اچھا تو، ایک دن کی بات، دو دن کی بات، ارے بھئی روز روز کی بات ہے۔ ہمارے اردو کے ماسٹر صاحب جو لنگڑے تھے۔ ان کی ایک ٹانگ گھٹنے سے کٹی ہوئی تھی۔ وہ بیساکھی کے سہارے اسکول میں آتے تھے۔ بیساکھی اپنی بائیں بغل میں دبا کر اچکتے اور گز بھر پر جا پہنچتے۔ پھر کھٹ سے بیساکھی رکھتے اور پھر ایک بار، دو بار تین بار بلکہ بار بار بیساکھی کے سہارے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے ماسٹر صاحب درجے میں آجاتے۔

تم جانو اسکول ہو یا بازار، ہر جگہ اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج کل بُرے لوگ زیادہ ہیں اور اچھے لوگ کم۔ جو لوگ زیادہ ہوتے

ہیں اور پھر انھیں خدا کا ڈر بھی نہیں ہوتا تو پھر وہ لوگ کمزور لوگوں کو بہت ستاتے ہیں۔ ہے نا یہ بات! وہ سمجھتے ہیں کہ ہم زیادہ ہیں، کوئی ہمارا کیا کر سکتا ہے۔

لیکن تم جانو، میں نے جو بات کہی تا کہ کبھی کبھی ستانے والوں کو اس دنیا میں بھی بدلہ مل جاتا ہے تو ہمارے اسکول میں بھی ایسا ہی ہوا۔

اسکول میں ہمارے ساتھ ایک لڑکا تھا جلال خاں۔ جلال خاں بڑا خراب لڑکا تھا۔ اس کے ساتھ بُرے لڑکوں کا پورا جتھّا تھا۔ ہمارے ماسٹر تیمور لنگ صاحب بیساکھی کے سہارے آتے وہ چپکے سے کہتا۔ ''تیمور لنگ!'' اس کے جتھے کے لڑکے جواب دیتے۔ ''زندہ باد۔''

ماسٹر صاحب یہ روز دیکھتے۔ مگر مجھے وہ بڑے سیدھے لگے۔ ماسٹر صاحب نے کبھی کچھ نہ کہا۔ نہ جلال خاں کو نہ دوسرے لڑکوں کو۔

ماسٹر صاحب ''زندہ باد'' کا مسخرہ پن دیکھ کر اور سن کر آگے بڑھ جاتے تو پھر جلال خاں ماسٹر صاحب کی نقل اتارتا اپنی ایک ٹانگ گھٹنے سے موڑ لیتا اور پھر کود کر چلتا۔

اور بھائی ایک بار تو غضب کر دیا جلال خاں نے۔ اس کی ڈھٹائی تو دیکھو۔ ایک دن بھرے درجے میں ماسٹر صاحب سے پوچھ بیٹھا کہ آپ کی یہ ٹانگ پیدائشی ہی ایسی ہے یا بعد میں کاٹی گئی۔

جلال نے ماسٹر صاحب سے پوچھا اور اس کے ساتھی ٹھٹھا مار کر ہنسے مگر واہ! شاباش ہے ماسٹر صاحب کو۔ وہ ایسے ہی رہے جیسے نام کو بھی غصہ نہیں۔

جلال خاں کا سوال سنا تو ماسٹر صاحب نے کتاب میز پر رکھ دی۔ ہاں اس وقت ماسٹر صاحب کتاب پڑھا رہے تھے۔ اچھا تو انھوں نے کتاب رکھ دی اور بولے، غصے سے نہیں بڑے سیدھے انداز میں بولے:

"جلال خاں! آج تم نے بہت اچھا سوال کیا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ تم میں سے کوئی پوچھے تو بتاؤں۔ جلال خاں میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے ایسا سوال کیا کہ دوسرے بچوں کو بھی اس سے فائدہ ہوگا۔"

ماسٹر صاحب نے اس طرح کہا تو جلال خاں جس نے سچی بات تو یہ ہے کہ بنانے کے لئے سوال کیا تھا۔ اس کا چہرہ شرم کے مارے پھیکا پڑ گیا۔ اس نے گردن جھکالی۔ اس کی اس بات سے میں یہ سمجھا کہ جلال خاں ابھی زیادہ بُرا نہیں ہوا ہے۔ اس کے اندر کچھ آدمیت یعنی یہ کہ شرافت، شرافت کے معنیٰ یہ کہ آدمیت ہے وہ ابھی بالکل ہی جانور نہیں ہوگیا ہے۔

ماسٹر صاحب نے آگے بتایا۔ "پیارے بچو! جلال خاں کے سوال کا جواب تم سب سنو۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میں بھی ایک ایسے ہی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ جس میں ایک استاد میری طرح کے لنگڑے تھے۔ میں ان کی ہنسی اڑاتا۔ مذاق

بناتا، ان کی نقل اتارتا اور یہ سب اس لئے کرتا کہ میرے ماموں چیر مین تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی میرا کر ہی کیا سکتا ہے۔ مگر بچو! تم جانو، سبھی لڑکے تو بُرے نہیں ہوتے۔ کچھ لڑکے ایسے بھی تھے کہ جو ان باتوں کو بُرا سمجھتے تھے۔ پھر بتاؤں کیا ہوا؟ یہی بات تمہارے سننے کی ہے۔

پھر یہ ہوا کہ ایک دن میں ماسٹر صاحب کی نقل اتار رہا تھا۔ ایک ٹانگ سے اچھل کر چل رہا تھا کہ ایک لڑکے نے آکر لنگڑی لگا دی۔ میں بُری طرح گرا۔ چت گرا چِت۔ چاروں شانے چت۔ لیکن میری وہ ٹانگ جو مڑی ہوئی تھی۔ وہ ویسی ہی میرے نیچے دب گئی۔ کڑاک سی آواز ہوئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب میں ہوش میں آیا تو ہسپتال میں تھا۔ میرے جسم میں جگہ جگہ چوٹیں آئی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ چوٹ تھی ٹانگ کی۔ جسے پھچیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں، کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینے بعد پھچیاں کھولی گئیں تو دیکھا کہ پاؤں پھولا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو بولا: ''زہرباد۔''

زہرباد، تم سمجھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹانگ میں زہر پھیل رہا ہے تو پھر میری ٹانگ گھٹنے سے کاٹ دی گئی۔ اگر نہ کاٹی جاتی تو پھر سارے جسم میں زہر پھیل جاتا اور میں مر جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک ٹانگ کھو کر میری سمجھ میں

آیا کہ اپنے استاد کا مذاق نہیں بنانا چاہئے۔

بچو! تم جانتے ہو کہ ہر بُرائی کا بدلہ مل کر رہتا ہے۔ پورا پورا بدلہ تو آخرت میں ہی مل سکتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ مجھے دیکھو، بدلہ مجھے ملا کہ نہیں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اب آخرت میں مجھے معاف کر دے کیونکہ وہاں جو سزا ملے گی وہ بڑی ہی بھیانک ہوگی۔ بچو! میں تمہارا استاد ہوں۔ تم سب میرے لئے دعا کرو کہ اللہ میاں مجھے معاف کر دیں۔

''بیٹا جلال خاں! تم نے سوال کیا تھا۔ تم بھی اللہ میاں سے دعا کرو۔ دل سے میرے لئے دعا کرو۔''

ماسٹر صاحب یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ میں نے جلال خاں کو دیکھا۔ وہ اپنے بستے پر جھکا ہوا تھا اور اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بڑی دیر تک درجے میں خاموشی رہی۔ اس کے بعد جلال خاں اٹھا اس نے کہا۔ ''ماسٹر صاحب مجھے معاف کر دیجئے۔'' اور اسی وقت انٹرول کی گھنٹی بجی۔ ہم سب درجے سے نکل گئے۔ جلال خاں بیٹھا روتا رہا۔ روتا ہی رہا۔ وہ اس وقت چپ ہوا جب ماسٹر صاحب نے کہا: ''معاف کر دیا بیٹا۔''

پھر کبھی کسی کی نقل نہیں اتاری اور نہ کمزوروں کو ستایا۔

☆☆☆

بہت خوب!

ایک بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے وزیروں سے کہہ رکھا تھا جس کسی کی بات پر میں کہوں ''بہت خوب'' اس کا منہ موتیوں سے بھر دینا۔

ایک بار وہ شکار کے لئے چلا۔ اس کے ساتھ دربار کے بڑے بڑے امیر اور وزیر بھی تھے۔ اور تھوڑا سا لشکر بھی تھا۔ بادشاہ ایک جنگل کے کنارے پہونچا۔ جنگل سے تھوڑے ہی فاصلے پر اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص کچھ پودے لگا رہا ہے۔ بادشاہ نے بوڑھے کو بلا بھیجا۔ بوڑھا بادشاہ کے سامنے آیا۔ سلام کیا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے اس سے کہا۔ ''تم اتنے بوڑھے ہو چکے ہو کہ تمہاری بھویں تک سفید ہو گئی ہیں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ پھر یہ پودے کیوں لگا رہے ہو۔ یہ پودے کہیں آٹھ دس سال میں پھل دیں گے۔ کیا تم آٹھ دس سال زندہ رہ سکو گے؟''

بادشاہ نے یہ پوچھا تو بوڑھے نے عرض کیا۔ ''حضور! میرے بزرگوں نے جو پودے لگائے تھے۔ ان کے پھل میں نے کھائے۔ اب میں اپنے بعد آنے

والوں کے لئے پودے لگا رہا ہوں۔ میرے بعد میرے بچے ان پودوں کا پھل کھائیں گے۔

بوڑھے کی یہ بات بادشاہ کو بہت پسند آئی۔ اس کی زبان سے نکلا۔ ''بہت خوب'' بادشاہ کی زبان سے ''بہت خوب'' نکلنا تھا کہ اس کے ایک مصاحب نے بڑھ کر بوڑھے کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ بوڑھے نے موتی اپنی جیب میں رکھے۔ پھر بولا۔ ''حضور! خیال تھا کہ میرے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے دس بارہ سال میں پھل دیں گے۔ لیکن مجھے تو آج ہی اس خدمت کا پھل مل گیا۔

بادشاہ کو بوڑھے کی یہ بات بھی پسند آئی۔ اس نے کہا ''بہت خوب، بہت خوب۔'' سن کر مصاحب نے پھر بوڑھے کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ بوڑھے نے منہ سے موتی نکال کر جیب میں رکھے۔ پھر بولا۔ ''حضور! میرے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے جب پھل دیں گے تو سال میں ایک بار دیں گے۔ لیکن مجھے تو ان کا پھل بات بات پر ملنے لگا۔

بادشاہ کو بوڑھے کی یہ بات بھی پسند آئی۔ اس نے کہا ''بہت خوب۔'' بہت خوب کا لفظ سن کر مصاحب نے پھر بوڑھے کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ بوڑھے نے موتی منہ سے نکال کر جیب میں رکھے۔ پھر بولا۔ ''حضور! میرے ہاتھوں

سے لگائے ہوئے یہ پودے جب پھل دیں گے تو فصل آنے پر ان کو بازار لے جا کر بیچنا ہوگا، لیکن مجھے تو گھر بیٹھے رقم ملنے لگی۔ یوں کہنا چاہئے کہ کنواں پیاسے کے پاس خود آ گیا۔

''بہت خوب، بہت خوب۔'' اب کی بار بادشاہ ایسا خوش ہوا کہ دو بار اس کی زبان سے ''بہت خوب'' نکلا۔ اب کی بار مصاحب نے دو بار بوڑھے کا منہ موتیوں سے بھرا۔ بوڑھے نے موتی نکال نکال کر جیب میں رکھے۔ پھر بولا۔ ''حضور! میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ جس ملک کا بادشاہ کاشت کاروں، باغبانوں اور دست کاروں کی قدر کرتا ہے اس کے ملک کے لوگ اسی طرح مالا مال ہوتے اور برکت حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح میں آپ سے برکت حاصل کر رہا ہوں۔''

''بہت خوب، بہت خوب، بہت خوب۔'' اس بار تو بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ تین بار ''بہت خوب'' اس کی زبان سے نکلا۔ اب کی بار تین بار بوڑھے باغبان کا منہ موتیوں سے بھرا گیا۔ بوڑھے نے موتیوں کو نکال کر جیب میں رکھا۔ اس کے بعد پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اتنے میں مصاحب نے آ کر کہا۔

''اے سمجھدار بزرگ! دربار کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کی بات پر بادشاہ کی زبان سے تین بار ''بہت خوب'' نکلے تو اس کو منہ مانگا انعام دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اب تم بادشاہ

سے مانگو، جو چاہو۔

بوڑھے کسان نے عرض کیا۔ ''حضور! ہم باغبانوں اور کسانوں کو سب سے زیادہ ضرورت پانی کی پڑتی ہے۔ اگر آپ ہمارے کھیتوں اور باغوں کی طرف نہر نکلوادیں تو ہم آپ کے لئے عمر بھر دعا کریں گے۔''

بادشاہ نے بوڑھے کی بات مان لی اور نہر نکالنے کا حکم دے دیا۔ بوڑھا خوش خوش واپس آیا۔ موتیوں سے اس کی جھولی بھری ہوئی تھی۔

☆☆☆

آج کا امیر کل کا فقیر

ایک سوداگر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے بہت دولت دی تھی۔ لیکن وہ سوداگر بہت ہی کنجوس تھا۔

ایک روز وہ کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی بیوی بھی کھانا کھا رہی تھی۔ دستر خوان پر بہت عمدہ گوشت پکا ہوا رکھا تھا۔ جس کو وہ بہت پسند کرتا تھا۔ اسی وقت ایک فقیر آیا اور کہنے لگا کہ ''اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔'' یہ سنتے ہی اس کی بیوی نے شوہر سے کہا ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دولت دی ہے جس سے ہم اچھے

کھانے کھارہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گوشت فقیر کو دے دوں۔''
شوہر نے کہا۔ ''ہم نے اپنے کھانے کے لئے یہ گوشت تیار کیا ہے۔ بھلا ہم فقیر کو کیسے دے سکتے ہیں۔'' یہ سن کر بیوی نے کہا۔ ''یہ گوشت جو ہم کھارہے ہیں وہ اللہ ہی نے تو دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ غریبوں کی مدد کرو۔ ہمارا فرض ہے کہ یہ گوشت فقیر کو دے دیں۔'' اس طرح بہت سمجھاتی رہی۔ مگر اس کی کسی بات کو شوہر نے نہ مانا۔ اور اس نے فقیر کو دروازے سے دھکّا مار مار کر بھگا دیا۔

یہ دیکھ کر بیوی کو دکھ ہوا۔ اس نے کئی بار شوہر کو نصیحت کی کہ وہ اللہ کی راہ میں کچھ نہ کچھ ضرور دیا کرے۔ لیکن شوہر اس سے ناراض ہوگیا اور اسے بھی گھر سے نکال دیا اور طلاق دے دی۔ کچھ دنوں کے بعد عورت نے ایک دوسرے سوداگر سے شادی کر لی۔ یہاں بھی ایک روز جب یہ دونوں میاں بیوی کھانا کھانے بیٹھے تو ان کے سامنے تلا ہوا گوشت رکھا تھا۔ اتنے میں ایک فقیر آیا اور کہنے لگا کہ ''اللہ کے نام پر مجھے تھوڑا کھانا دو، میں بہت بھوکا ہوں۔'' یہ سنتے ہی اس کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ ''دیکھو یہ گوشت اللہ نے دیا ہے اور ہم پھر ایسا ہی گوشت دوبارہ بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ گوشت میں اس فقیر کو دے دوں۔''

یہ سنتے ہی شوہر نے کہا ''بے شک یہ گوشت خوشی سے فقیر کو دے سکتی ہو۔''

بیوی نے جا کر گوشت اس فقیر کو دے دیا۔ جب فقیر کو گوشت دے کر واپس ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ رونے لگی۔ یہ دیکھ کر سوداگر نے جو اس کا نیا شوہر تھا، پوچھا۔ ''بتاؤ کہ تم کیوں رو رہی ہو؟'' بیوی نے پہلے تو بتانے سے انکار کیا۔ مگر شوہر نے بار بار پوچھا تو بتانا پڑا، کہنے لگی کہ یہ جو فقیر اپنے گھر پر آیا تھا، وہ ایک دوسرے شہر کا سوداگر تھا۔ وہ بڑا مال دار تھا۔ وہ بھی تمہارے جیسا ہی امیر تھا۔ مگر وہ اللہ کی راہ میں خیرات نہیں کرتا تھا۔ یہ فقیر میرا وہی شوہر تھا۔ ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ایک روز شام کے وقت ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک فقیر آیا اور کہا۔ ''اللہ کے نام پر کچھ کھانے کو دو تو اس پر دھکّے دے کر بھگا دیا۔ آج وہ فقیر ہو گیا۔ اور بھیک مانگتا ہوا، ہمارے دروازے تک آیا۔ اللہ کے ہاتھ میں امیر کو غریب بنانا اور غریب کو امیر بنانا ہے۔'' یہ سن کر اس نے کہا۔ ''اس وقت جو فقیر تمہارے پاس گیا تھا وہ میں ہی تو تھا۔''

☆☆☆

مالک

''خبردار اِدھر قدم مت رکھنا!''

''کیوں؟ تم کون ہوتے ہو؟''

’’بتا دوں! میں کون ہوں۔ گدھے کہیں کے!‘‘

’’میری گھاس بھی چر لی۔‘‘

’’میری گھاس بھی چر لی اور زبان لڑاتا ہے!‘‘

’’گھاس کیا تیرے باپ کی ہے؟‘‘

’’اچھا تو اس طرح نہ مانے گا، لے گھاس کھا!‘‘

اس تو تو میں میں کے بعد بیل نے گدھے کے سینگ مار دیا۔ نوکیلے سینگ گدھے کی ران میں لگے اور خون نکلنے لگا۔ وہاں کچھ دوسرے جانور بھی تھے۔ وہ ان دونوں کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ وہ دوڑے دوڑے گئے اور جنگل کے بہت سے جانوروں کو بلا لائے۔

سب نے پوچھا۔ ’’ارے او گدھے! کیا ہوا اور کیوں رو رہا ہے؟‘‘

’’دیکھتے نہیں! اس بیل نے مجھ پر کیسا ظلم کیا ہے۔ یہ دیکھو میری ران سے خون بہہ رہا ہے۔‘‘

جنگل کے جانوروں نے بیل سے پوچھا۔ ’’تو نے اس کے کیوں سینگ مارا؟ بیل نے جواب دیا کہ یہ گدھا میری گھاس چر رہا تھا۔‘‘

بیل کی یہ بات سن کر گھوڑا بولا: ’’کیوں رے بیل! تو گھاس کو اپنی بتا رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ میں گھاس کا سب سے زیادہ شوقین ہوں۔ گھاس میری

ہے کہ تیری؟''

اور یہ کہہ کر گھوڑے نے دولتّی بیل کے جمائی۔ بیل نے چاہا کہ دولتّی کا بدلہ لے اور گھوڑے پر بھی سینگوں سے وار کرے۔ لیکن جنگل کے سارے جانوروں کو دیکھ کر سہم گیا۔

بیل تو سہم چکا تھا اس لئے وہ کچھ نہ بولا۔ لیکن ایک بھینسے نے گھوڑے کو ڈانٹا۔ ارے او گھوڑے! تو کون ہے، گھاس کو اپنی بنانے والا۔ گھاس کا مالک میں ہوں۔'' یہ کہہ کر بھینسا گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اور چاہا کہ گھوڑے کے ایک ٹکّر مارے۔ لیکن ہر طرف سے جانوروں نے اسے روکا اور کہنا شروع کیا۔

''واہ بھئی وا! یہ خوب رہی۔ جنگل کی گھاس اگر کسی ایک کی ہوتی تو کاہے کو کوئی جئے گا۔ اب تک تو کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جنگل کا مالک میں ہوں۔ اب یہ جھگڑا شروع ہو گیا۔''

جنگل کے زیادہ جانور یہی بات کہہ رہے تھے۔ جو گھاس کے مالک بننا چاہتے تھے۔ وہ تو بس ایک گدھا۔ دوسرا بیل۔ تیسرا بھینسا، اور ایسے ہی دو چار اور بڑے پیٹ والے جانور تھے۔ لیکن زیادہ جانوروں کے مقابلے میں چار چھ بڑے جانوروں کی بات نہ چلی۔ اور یہ سوچا جانے لگا کہ سچ مچ گھاس کا

مالک کون ہے؟

بہت سوچنے پر بھی یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ گھاس کا مالک کون ہوسکتا ہے۔آخر طے پایا کہ چل کر مٹھو میاں سے پوچھنا چاہئے۔

سب مٹھو میاں کے پاس گئے اور ان کے سامنے ساری بات رکھا۔

مٹھو میاں نے کچھ دیر سوچا اس کے بعد بولے:

''گھاس کا مالک تو وہ ہوسکتا ہے جو گھاس بنا لے۔''

''گھاس ہم میں سے کون بنا سکتا ہے؟'' تمام جانوروں نے مٹھو میاں سے کہا۔

''تو پھر تم گھاس کے مالک کس طرح ہو سکتے ہو۔'' مٹھو میاں نے ڈانٹا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم گھاس کے مالک نہیں تو گھاس کھا بھی نہیں سکتے؟'' سارے جانوروں نے پوچھا۔

مٹھو میاں نے ذرا کی ذرا گردن جھکائی۔اس کے بعد بولے:

''کیا تم سب یہ جانتے ہو کہ گھاس کون پیدا کرتا ہے؟''

''گھاس تو اللہ میاں نے پیدا کی ہے۔'' تمام جانوروں نے جواب دیا۔

''تو بس!'' مٹھو میاں نے فیصلہ کیا۔''تو بس گھاس کا مالک اللہ ہی ہے اور گھاس ہی کیا سبھی کچھ اس نے پیدا کیا ہے۔وہ تو سبھی کا مالک ہے۔اللہ کی

بنائی ہوئی چیز کو جو اپنی کہے اور مالک بن بیٹھے وہ جھوٹا اور ظالم ہے۔ اب تم سب جاؤ اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو کھاؤ پیو اور اس کا شکر ادا کرو اور اسی کو اپنا مالک سمجھو اور جو جانور اپنے کو مالک کہے تو تم سب مل کر اس سے لڑو۔ اتنا لڑو، اتنا لڑو کہ یا تو وہ توبہ کرے یا پھر جنگل ہی سے نکل جائے۔"

مٹھو میاں کی بات اور ان کے فیصلے کو سب نے پسند کیا۔ اب جو سارے جانوروں کو ایک رائے دیکھا تو گدھے کو کچھ عقل آئی۔ بیل بھی کچھ سمجھا اور بھینسا بھی کچھ نہ بول سکا۔ اور سب اِدھر اُدھر جا کر گھاس چرنے لگے۔

☆☆☆